"خوابوں میں ہمیشہ تمنائیں پوری ہوتی ہیں۔ ہمارا اِڈ دن کے وقت اِگو اور سپر اِگو کی نگرانی میں رہتا ہے۔ لیکن رات کے پڑتے ہی وہ رسیاں تڑوا کر اپنی تمنائیں پوری کرتا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں میرا مطلب؟"

لڑکیوں کا گروہ جوان سے قریب تر تھا، اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"گو سپر اِگو اپنا تمام تر تسلط نیند میں بھی نہیں چھوڑتا۔ لیکن اِڈ بغیر سپر اِگو کو مجروح کئے اپنی تمناؤں کا بھیس بدل کر عموماً انہیں مجروح کرنے کی حد تک اپنی من چاہی مراد پاتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں پروفیسر ضیاء۔"

ضیاء صاحب نے آہستہ سے ہاں کہا۔ وہ اس وقت اپنے ٹیکوں کے کارڈ، فارن ایکسچینج اور پی او اے سی کے ٹکٹ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جو ابھی تک ان تک نہ پہنچا تھا۔

"خواب دیکھنے میں تو یہ مغل شہزادے سبھی حاتم تھے۔ لیکن شاہجہاں کے خواب سنگِ مرمر کے بنے تھے۔ آپ جانتی ہیں نا کہ یہ عمارت شاہجہاں نے بنوائی تھی؟"

لڑکیاں مسکرانے لگیں۔ بھلا اتنی سی بات کون نہیں جانتا؟

"شاید آپ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ باغ بھی ایک خواب کی تعبیر ہے۔ شاہجہاں کے خواب کی تعبیر . . . آپ لوگ اگر چاہیں تو میں یہ خواب آپ کو سناؤں؟"

یس یس کی صدائیں ہر طرف اٹھنے لگیں۔

"کہتے ہیں کہ ایک دن شاہ جہاں اپنے باپ کے مقبرے پر شب باش ہوا۔ ساری

رات باغِ دلکشا میں آرام سے گذری۔ صبح کے وقت کیا دیکھتا ہے کہ ایک ایسا باغیچہ نگاہوں کے سامنے ہے جس میں پانی اوپر والے درجے سے ہو کر درجۂ نشیب کو جاتا ہے۔ اور وہاں سے ہو کر پھر نیچے کو بڑھتا ہے۔ خواب میں کسی نے کہا کہ یہ باغِ ارم ہے سو جب آنکھ کھلی تو ارم کو زمین پر بنانے کا ارادہ کیا۔ اور کامیاب ہوا۔

پروفیسر بیگ جو انگلش لٹریچر پڑھاتے تھے۔ اور جنہیں اوڈ، ایگو اور شیکسپیئر سے زیادہ ہیملیٹ اور براؤننگ سے عشق تھا، جلدی سے انگریزی میں بولے۔

"علی مردان خاں زندہ نہ ہوتا تو شاہجہان کے سارے خواب طاق میں دھرے رہتے۔ ویسا صاحبِ کمال صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ نہروں کا وہ سلسلہ چلایا کہ ہند کے ریگ زار کو لہلہاتا سبزہ بنا دیا۔"

ظفر اور غازی کی ٹرالی محلِ میانہ کے لمبی راستوں سے ہو کر باغ حیات بخش میں پہنچ چکی تھی کہ جہاں مقام ساون بھادوں اور دو خوبصورت بارہ دریاں موجود ہیں پہلے یہ دونوں بارہ دریاں سنگِ مرمر کی تھیں۔ لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان سے کچھ ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ یہاں سے اکھاڑ کر امرتسر کے رام باغ میں جا نصب کیں۔ اب یہ دونوں بارہ دریاں خشتی ہیں۔

ظفر اس تختِ سنگ پر پہنچا کہ جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا پنجرہ دار کٹہرا بنا ہے۔ اس تخت کو شاہجہان کی خاص یادگار سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ یہیں حیات اس پر اکثر اجلاس فرمایا کرتا تھا۔ تخت پر چڑھ کر ظفر نے کیمرے کا اپرچر فٹ کیا۔ اور پیمانہ

محل کی جانب لینز کو گھمایا، اور پروفیسر اعجاز کو آواز دی۔

"پروفیسر صاحب ذرا ادھر رخ کیجیے"، آپ بھی پروفیسر ضیاء"

لڑکیوں نے کچھ ہٹ جانے کا بہانہ کیا، کچھ چہرے پھیرنے کے عمل میں مشغول ہوئیں
چیں بچیں چہرے اور نزاکت سے مڑی گردنیں اتنی تیز نہ تھیں کہ تصویر نہ اتر جاتی "ظفر
تخت شاہجہانی سے ایک چھوڑ پوری پانچ تصویریں اتاریں اور ایک ایک میں لشکر کی چاد
اوڑھے رشیدہ موجود تھی۔

کھانا کھانے کے لئے باغ حیات بخش میں پڑاؤ ڈالا گیا، عین بائیں جانب جہاں
سرو کے درخت ایستادہ ہیں، ان کی چھاؤں میں دریاں ڈال کر ٹفن باسکٹیں کھولی گئیں
اس خورد ونوش کے سامان کے لئے ایک ہفتہ پہلے پانچ پانچ روپے چندہ لے کر ظف
کے سپرد کئے گئے تھے۔ لڑکوں نے کھلم کھلا اور چیلنج کے طور پر کھانا کھایا۔ لڑکیوں
چھپ چھپ کر نظریں بچا بچا کر بظاہر اعتراض کرتے ہوئے، انکار کرتے ہوئے لڑکو
کی نسبت دوگنی چیزیں ہضم کر دیں۔

ڈاکٹر اعجاز جو ذیابطیس کے مریض تھے، جیب سے سیکرین کی گولیاں نکا
کر بولے۔

"ڈمپل میری چائے میں یہ گولیاں ڈال دینا۔ ۔ ۔ دو۔ ۔ ۔ تھینک یو
ڈمپل نے سیکرین کی ڈبیا لے کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ چائے کا وقت ابھی
دور تھا۔

"ضیا تم امریکہ کب پہنچ رہے ہو؟" ڈاکٹر اعجاز نے سوال کیا۔

"ابھی تو ٹکٹ بھی نہیں پہنچا سر!.. لیکن خیال ہے دو دن بیروت میں رہونگا، وہاں میرے ایک انکل ہیں۔ وہاں سے لندن، دس دن لندن میں قیام ہوگا۔ وہاں سے اے چوسٹس۔"

"وہاں ڈاکٹر المیر بروز سے تمہاری ملاقات ہوگی۔ میں تمہیں ایک خط لکھ دونگا تعارفی وہ تمہاری ہر طرح مدد کریں گے۔"

پروفیسر اعجاز سے تھوڑی دور غازی ارشید ظفر اور افتخار بیٹھے تھے، ان کی پلیٹوں میں مرغ کی ہڈیاں، کالی مرچیں، ٹماٹر کے پرت اور کچھ آلو کنارے لگے تھے۔ وہ اس قدر کھا چکے تھے کہ اب لڑکیوں کی طرف دیکھنا یا چہل قدمی کے لئے اٹھنا بھی ممکن نہ رہا تھا، باقی لڑکے ٹکڑیوں میں بٹ کر، کچھ تالاب کی جانب اور کچھ نیچے بائیں باغ کی طرف جا چکے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد لڑکیاں مغلیہ حمام کی طرف چلدیں۔ روش کے اوپر سے نیچے جھانک کر ڈمپل نے کہا۔

"اللہ! کس قدر مشکل ہے یہاں نہانا، نہ ٹب ہے نہ سنک... توبہ ان مغلوں نے اور تو سب کچھ کیا لیکن حمام دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ تہذیب سے کس قدر دور تھے۔"

ط جلدی سے بولی۔

"واہ ڈمپل واہ! یہاں ٹب اور سنک کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں نہانے کر

فوّارے ہوں وہاں جھیلوں کے ساکت پانیوں کا کیا فائدہ ؟ . . "

بات مغلیہ حمام سے ترکی حمام اور ترکی حمام سے جاپانی غسل ، اور جاپانی غسل سے ہندوؤں کی گودی پر اور گودی سے ہو کر ، رہٹ کے چہ بچہ تک اور چہ بچے سے سمندروں کے ارد گرد پھیلی ریت اور ریت پر لیٹے ہوئے سورج کا غسل لیتے ہوئے جسموں تک پہنچی . . . رشید صرف خاموش تھی ، اور لشکری چادر سر پر لیے چپ چاپ ، پیچھے پیچھے ستکے جا رہی تھی ۔ اس حمام نے تو جیسے اسے مبہوت کر دیا تھا ۔

یہ حمام کہ شاہجہاں بادشاہ کے ذوق کی کھلی دلیل ہے ، سنگ مرمر کا تین درجہ حمام کہ جہاں پانی گرنے کی آواز ، بطور بارش باراں مسموع ہوتی ہے ۔ طاقچہ ہائے محرابی خرد خرد یہاں اس قماش اور خوبی سے بنے ہیں کہ جب یہاں چراغاں کر کے مغلیہ شہزادیاں غسل فرماتی ہونگی تو شعاع چراغاں بطور برق اور پانی بارش سے مماثل نظر آتا ہوگا ۔ بیچ میں پانچ فوّارے کہ پانی جن کا خزانہ آب سرد سے ۔ مہتابی کی طرح چھوٹتے ہیں ۔ اس حمام کے سامنے جو غلام گردش ہے کہتے ہیں کہ اس میں کنیزیں پھولوں کے طشت لئے ، دیبا ، کمخواب اور ریشم کے لباس کندھوں پر رکھے ، حمام کی جانب گل افشانی کرتی تھیں ۔ حمام کے اوپر کہ جہاں سے اب نیچے حمام کھلا نظر آتا ہے ۔ سیاہ بانات جیسے جسموں والی سیاہ چشم اور دابگیاں آبنوسی کندھوں پر آبدار تلواریں دھرے پہرہ دیتی تھیں کہ کسی کی نظر بھٹک کر اس جانب نہ جا سکے ۔ عماریوں میں لدا کر لباس آتے تھے ۔ تالاب کے چار رویہ قطاروں میں کنیزیں دست بستہ کھڑی ہاتھوں ہاتھ ان کو دیتی تھیں ، گل پاش اور عطر بیز پانیوں میں نہاتی شہزادیوں تک جیسے

یہ لباس پہنتے، ان کو سینکڑوں ہاتھ مس کر چکے ہوتے، ہزاروں حریصانہ نظریں ان کے آرپار ہو چکی ہوتیں۔ وہ نظریں جو براہِ راست شہزادیوں کے صندلی جسموں تک نہ پہنچ سکتی تھیں یوں کپڑوں میں ملفوف ان تک جا پہنچتیں۔

شام کے سائے جب شالامار تک پہنچے، تو فضا میں عجیب قسم کی سردی، خوشبو اور سائے بڑھنے لگے۔ دن کی روشنی میں جو باغ کھکھلاتا گل داؤدی کا پھول تھا۔ اب زرد رو کر کلی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ حیات بخش باغ کی وہ دیوار جو محل میانہ سے منسلک تھی اور جس میں دو بغلی دروازے اور پر محل میانہ تک پہنچتے تھے۔ شام کی سیاہی میں یہ پتھر سرخ پتھر اس تہہ خانے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ جہاں شاہجہان نے اورنگ زیب کے ہاتھوں تخت کھو کر دن بسر کئے تھے۔ سرد دن کے وقت سنجیدہ، شام کے وقت پُراسرار اور رات کو ہیبت ناک ہو جاتا ہے۔

اسی طرف جہاں دریائی کھوئی ہے۔ اور اب ایک کینٹین بن چکی ہے۔ ظفر اور غازی نے پہنچ کر چائے کا آرڈر دیا۔ فولادی کرسیوں پر سیر کے شوقین بیٹھے کوکا کولا پی رہے تھے۔ چائے کے ہاف سیٹوں کے ساتھ باسی کیک اور پلستر اکھڑی پیسٹریاں چلی آ رہی تھیں۔ نگار خانہ میں پانچ اور دودھ کی بوتلیں، کوکا کولا کے کریٹ، چائے کی پتیوں کے خالی ڈبے، باسی کیک اور کام کرنے والوں کی سائیکلیں پڑی تھیں...

کہتے ہیں کہ یہاں ایک انگریز سیاح نے قیام کیا تھا۔ نگار خانے کی چھت پر جب وہ مچھروں کے خوف سے مسہری لگا کر اور بلاؤں سے مقابلہ کرنے کے لئے

سرہانے پستول رکھ کر سوتا تھا تو اس کے خوابوں میں میانہ محل میں بال روم ڈانسنگ ہوتی تھی۔ اور وہ مغل لباس پہنے روش پر ٹہلتا پھرتا تھا۔

دو گولیاں سونیکس ڈال کر ڈمپل نے چائے کی پیالی ڈاکٹر اعجاز کو پیش کی۔ سارے میں صرف برتنوں کا شور تھا۔

ظفر نے پیسٹری کی تھالی رشیدہ کی جانب بڑھا کر آہستہ سے کہا۔

”لیجئے۔ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔“

رشّو نے پلکیں اٹھائیں۔ یہ نظر بالائی کی طرح ملائم اور شہد کی طرح میٹھی تھی۔ اس نے آہستہ سے پیسٹری کا ٹکڑا اٹھایا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظروں نے دست پنجہ ملایا، پھر شرقی اور غربی پھاٹکوں کی جانب مڑ گئیں۔

شالامار باغ کے تین تختے، حمام کے تین درجے، ساون بھادوں اور میانہ محل کی چادر سے کہیں زیادہ خوبصورت ظفر کو وہ آنکھیں لگیں، جو لمحہ بھر کو اٹھیں اور پھر پلکوں کا نقاب اوڑھے رخساروں سے پیوست ہو گئیں۔

ھورڑکی نے چاہے وہ آدھی چمچ چینی پیتی تھی چاہے دو چمچ، چائے میں چینی ڈالنے سے انکار کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی رشیدہ نے بھی چائے میں چینی نہ ملائی۔ پہلا گھونٹ ہی حلق میں گیا تھا کہ ابکائی آگئی۔ ایسا بے مزہ آب جوش اور وہ بھی پیتا پیتا اس نے آج تک نہ چکھا تھا۔ پیالی کو پرے سرکا کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ معاً اس کی نظر سامنے گئی۔ ظفر تالاب والے چبوترے پر ٹانگیں لٹکائے کیمرے کا رخ اس کی طرف

کیے بیٹھا تھا۔ رشیدہ نے اٹھ جانا چاہا بھاگ جانا چاہا، لیکن چاہنے اور بھاگنے میں
جو وقفہ تھا، اس میں تصویر اتر چکی تھی۔

ظفر نے نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ کیمرے کو کندھے پر لٹکایا اور
خشتی بارہ دری کی طرف چلا گیا۔

جب ظفر پکنک کے بعد گھر پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کندھے
پر کونین کی دولت لٹک رہی ہے۔ پہلی بار اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ کیمرے میں سے
سپول نکال کر کسی سٹوڈیو کے حوالے کرے۔ اور نیگیٹو دھلائے۔ پھر جی میں یہ تمنا بڑی
جان لیوا ابھر رہی تھی کہ کسی طرح تصویریں فوراً دھل جائیں اور وہ لٹھے کی چادر میں لپٹی
لڑکی کو دیکھ سکے۔ ۔ ۔ ۔ وہ باقی لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی! سٹین لس سٹیل کے
برتنوں میں بہادر لپوری کوزہ۔ ۔ ۔ ۔ کانچ جیسا نازک، چینی آرٹ کی طرح دلآویز
اور ہڑپے کی تہذیب کی طرح پراسرار۔ ۔ ۔ ۔

وہ گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح گھر پر میلہ کی سی ہڑبونگ مچائی تھی۔ یہ ایک بڑی برادری
کا سردار خاندان تھا۔ آنگن میں اماں کھری چارپائی پر بیٹھی پرات بھر پیاز کاٹ رہی تھیں،
پاس ہی دو چار تائیاں، ممانیاں، خالائیں، چھوٹی توپ جیسے جسموں والی، سفید دوپٹے
اور سفید شلواریں پہنے بیٹھی تھیں۔

یہ عورتیں کسی زمانے میں گوری چٹی جوان، اور فتنہ ساز ہوں گی، اب فقط یہ
ٹیپ ریکارڈر تھیں۔ اور ان پر جوان لڑکیوں کی بے حیائی، زچہ بچہ کے نقصے،

سرہانے پستول رکھ کر سوتا تھا تو اس کے خوابوں میں میانہ محل میں بال روم ڈانسنگ ہوتی تھی ۔ اور وہ مغل لباس پہنے روش پر ٹہلتا پھرتا تھا ۔

دو گولیاں سوئیٹکس ڈال کر ڈمپل نے چائے کی پیالی ڈاکٹر اعجاز کو پیش کی ۔ سارے میں صرف برتنوں کا شور تھا ۔

ظفر نے پیسٹری کی تھالی رشیدہ کی جانب بڑھا کر آہستہ سے کہا ۔

”لیجیے ۔ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ۔“

رشو نے پلکیں اٹھائیں ۔ یہ نظر بالائی کی طرح ملائم اور شہد کی طرح میٹھی تھی ۔ اس نے آہستہ سے پیسٹری کا ٹکڑا اٹھایا ۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظروں نے دست پنجہ ملایا ، پھر شرقی اور غربی پھاٹکوں کی جانب مڑ گئیں ۔

شالامار باغ کے تین تختے ، حمام کے تین درجے ، ساون بھادوں اور میانہ محل کی چدر سے کہیں زیادہ خوبصورت ظفر کو وہ آنکھیں لگیں ، جو لمحہ بھر کو اٹھیں اور پھر پلکوں کا نقاب اوڑھے رخساروں سے پیوست ہو گئیں ۔

ڈورتھی نے چاہے وہ آدھی چمچ چینی پیتی تھی چاہے دو چمچ ، چائے میں چینی ڈالنے سے انکار کیا ۔ ان کی دیکھا دیکھی رشیدہ نے بھی چائے میں چینی نہ ملائی ۔ پہلا گھونٹ ہی منہ میں گیا تھا کہ ابکائی آگئی ۔ ایسا بے مزہ آب جوش اور وہ بھی پھیکا پھیکا اس نے آج تک نہ چکھا تھا ۔ پیالی کو پرے سرکا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی ۔ معاً اس کی نظر سامنے گئی ۔ ظفر تالاب والے چبوترے پر ٹانگیں لٹکائے کیمرے کا رخ اس کی طرف

کئے بیٹھا تھا۔ رشیدہ نے اٹھ جانا چاہا بھاگ جانا چاہا، لیکن چاہنے اور بھاگنے میں
جو وقفہ تھا، اس میں تصویر اتر چکی تھی۔

ظفر نے نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ کیمرے کو کندھے پر لٹکایا اور
خشتی بارہ دری کی طرف چلا گیا۔

جب ظفر پکنک کے بعد گھر پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کندھے
پر کونین کی دولت لٹک رہی ہے۔ پہلی بار اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ کیمرے میں سے
سپول نکال کر کسی سٹوڈیو کے حوالے کرے۔ اور نیگیٹو دھلائے۔ پھر جی میں یہ تمنا بڑی
جان لیوا ابھر رہی تھی کہ کسی طرح تصویریں فوراً دھل جائیں اور وہ لٹھے کی چادروں میں لپٹی
لڑکی کو دیکھ سکے۔ ۔ ۔ ۔ وہ باقی لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی! سٹین لس سٹیل کے
برتنوں میں بہاولپوری کوزہ ۔ ۔ ۔ ۔ کانچ جیسا نازک، چینی آرٹ کی طرح دلآویز
اور ہڑپے کی تہذیب کی طرح پراسرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح گھر میں میلے کی سی ہڑبونگ مچائی تھی۔ یہ ایک بڑی برادری
کا سردار خاندان تھا۔ آنگن میں نانی کھری چارپائی پر بیٹھی پرات بھر پیاز کاٹ رہی تھیں؛
پاس ہی دو چار، تائیاں، ممانیاں، خالائیں، چھوٹی توپ جیسے جسموں والی، سفید دوپٹے
اور سفید شلواریں پہنے بیٹھی تھیں۔

یہ عورتیں کسی زمانے میں گوری چٹی جوان، اور فتنہ ساز ہوں گی، اب فقط یہ
ٹیپ ریکارڈر تھیں۔ اور ان پر جوان لڑکیوں کی بے حیائی، زچہ بچہ کے قصے،

موجودہ پود کی بے سروپا باتیں، غیر موجود عورتوں کی بدگوئیاں، اپنے بچوں کے لئے انھوں نے جو قربانیاں دیں اور کس طرح وہ طوطا چشم واقع ہوئے۔ ان کی تفصیلات کے ٹیپ چڑھے تھے۔

"اتنی دیر لگادی پکنک پر؟" ماں نے آنکھوں پر عینک درست کر کے پوچھا۔

"بس جی کچھ ہو گئی۔۔۔"

"خالہ حمیرا کو سلام نہیں کیا۔ شملے میں ان کا ہمارا مکان ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔"

"ادھر تو آ۔۔۔ کون ہے؟۔ منظر؟"

"نہیں حمیرا۔ ظفر ہے۔۔۔" ماں نے جلدی سے غلطی درست کی۔

"اچھا، اچھا۔۔۔ تب تو یہ گود میں تھا جب دیکھو اسے دست ہی لگے رہتے تھے۔ اوپر سے شملے کی ٹھنڈ بہن جی کا تو سارا دن پوتڑے دھوتے نکلتا۔ ادھر آ۔"

علینے اس وقت جب کہ وہ مس یونیورس سے مل کر آرہا تھا۔ اپنے دستوں کا ذکر سن کر وہ بوکھلا گیا۔

"پاس جاؤ۔۔ خالہ سے ملو۔۔۔ کیا بیوقوف لڑکے ہیں آج کل کے۔۔ ۔ چلو۔۔"

خالہ حمیرا نے ظفر کو اپنے آپ سے لپٹا لیا۔ جیلی کے تودے سے لپٹ

کر ظفر کو عجیب کراہت سی آئی۔ خالہ کے منہ سے روزہ داروں کی سی بو کا بھبھوکا نکلا۔ تائی ساری دعاؤں کو اس خوشبو میں لپیٹ کر انہوں نے ظفر کی نذر کیا کہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ اس میں باقی نہ رہا۔

جلدی سے سب کو سلام کر کے وہ اندر کی طرف چلا، عجیب مصیبت تھی اپنے اس گھر میں گھستے ہی ہر روز سے اسی نوعیت کی عورتوں سے بغل گیر ہونا پڑتا تھا۔ ادھر جوان لڑکیاں جوان معمر عورتوں کے ساتھ آتی تھیں۔ ان کا رویہ بھی طرفہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی پھڑپھڑاتی فاختائیں سی اڑنے لگتیں، بڑے پراسرار قہقہے بلند ہوتے۔ کھسر پھسر شروع ہو جاتی، ظفر کی تو جان پر بن جاتی۔

ڈرائینگ روم میں حسب معمول بھانجیوں، بھتیجیوں، نواسیوں، پوتیوں کا انبار لگا تھا۔ کہیں کہیں نمک کے طور پر کوئی بھانجا بھتیجا بھی صوفے میں دبکا بیٹھا تھا۔ بہرکیف ہمیشہ کی طرح اس کمرے میں عموماً نوجوان لڑکیوں کا تسلط رہتا تھا۔ لتا کا گیت ریڈیو پر بج رہا تھا۔۔ وہ ایک کنیز صورت لڑکی اپنے آپ کو اس وقت شہزادی مہ پارہ سمجھ رہی تھی۔

لتا آہیں بھر رہی تھی۔ انتظار کر رہی تھی۔ گھر بار نہ کے لیے کلائی چھڑا رہی تھی۔ اور کلائی چھٹ جانے کے باوجود بڑی شوخ چشمی سے جی کڑا رہی تھی۔ وہ پوکھر کے پاس پانیوں میں کنکر پھینکتی انتظار کر رہی تھی۔ اس کا انگ انگ محبت میں سرشار تھا۔۔۔ وہ ازلی اور ابدی عورت کا روپ دھارے صرف محبت کیے جا رہی تھی۔۔۔ اس کی زندگی

میں صرف ایک لفظ تھا . . . ایک فعل تھا . . . ایک اسرار تھا . . . اور وہ تھی محبت! اس کا جسم، اسکی شخصیت، اس کی باتیں سب اسی ایک بات میں ڈھلی تھیں . اور یہ محبت اس کی آواز کے محدب شیشے سے گذر کر کئی لاکھ گنا بڑی ہو کر لڑکیوں تک پہنچ رہی تھی .

لڑکیاں ان نغموں میں سرشار ہو کر سیراب عورتوں کی طرح محسوس کر رہی تھیں، نوخیز لڑکیاں جنکا جسم ابھی ان جانے جی سے اپنی تبدیلیوں کو قبول کرنے میں مصروف تھا، شاداب لڑکیوں کی طرح آشفتہ سر ہونے کے خواب دیکھ رہی تھیں .

لتا کی آواز نے ایک عجیب کام کر دکھایا تھا . یہ ایک ایسا انکیوبیٹر تھا جس میں انڈا ڈالتے ہی چوزی مرغی تیار ہو جاتی ہے . لڑکیوں کو بس لتا کا نغمہ درکار تھا . اور اپنا جرد . . . وہ اندر ہی اندر نوجوان لڑکوں سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے محبت کر رہی تھیں محبت سے محبت کر رہی تھیں . . محبت کے عکس سے محبت کر رہی تھیں .

لتا کے انکیوبیٹر میں جوان کی ہوئی ان گنت لڑکیوں سے گھر اٹا پڑا تھا .

ظفو کو جھرجھری سی آ گئی . ان ہی لڑکیوں میں کہیں کوئی اس کی دلہن بھی تھی .

وہ اوپر والی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سیڑھیوں کے موڑ پر مظفر بھائی مل گئے وہ مال پر سپورٹس گڈز کی بڑی چمکیلی سی دکان کے مالک تھے .

"کہاں رہتے ہو صاحب بہادر !" انہوں نے مسکرا کر پوچھا .

"یہیں رہتا ہوں جی . . . !"

"ملاقات نہیں ہوتی آپ سے۔"

"آپ دوکان پر رہتے ہیں، میں کالج چلا جاتا ہوں۔ یہ مشکل ہے۔"

"ہاں یار! یہ مشکل ہے۔ . . . اچھا بھئی اتوار کو رکھیں گے کسی روز ہی۔"

"ہاں جی۔ رکھیں گے جی . . . انشاء اللہ۔"

پکنک کا ہر لمحہ یاد کرتے ہوئے ظفر دوسری منزل پر پہنچا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

دوسری منزل خاص الخاص شادی شدہ نو عمر عورتوں کے لیے مخصوص تھی۔ کمروں سے پوتڑوں کی باس اور کیوٹی کیورا پاوڈر کی ملی جلی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ غسل خانوں میں چھوٹے چھوٹے جانگھیئے، فراکیں، بش شرٹیں اور پاجامے دُھل رہے تھے۔ غسل خانوں سے باہر پانچ برس سے کم عمر کے بچوں کے چھوٹے چھوٹے کموڈ پڑے تھے۔ کوڑے کے ڈبوں کے پاس، بسکٹوں کے ڈبے، بوتلیں، پلاسٹک کے ٹوٹے کھلونے، پرانی سائیکلیں اور ایسے انگنت گندے کپڑے پڑے تھے جن سے عورتوں نے فرش پر گرا ہوا پیشاب اور بچوں کا سفید سفید پاخانہ صاف کر رکھا تھا۔

یہ بالائی منزل گھر کی امیر ترین، اور گندی ترین منزل تھی۔ یہاں بکسوں میں طلائی زیور، نائیلون، زری کی قمیصیں، نقرئی برتن، ٹرانسسٹر، الیکٹرک شیونگ ریزر . . . فرانسیسی سینٹ، بدیسی گھڑیاں، نقدی، اور انعامی بانڈ تہ در تہ بند تھے۔ پانچ شادی شدہ نوجوان عورتیں، بمع اپنے بچوں کے یہاں رہتی تھیں، مرد اس منزل کے

سونا بٹورنے میں کچھ اس درجہ مشغول تھے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس منزل کی حالت سیاسی اکھاڑے کی سی ہے۔ ہر روز ایک نئی پارٹی بنتی ہے اور پچھلی پارٹی کے پول کھولتی ہے۔ اس منزل کی اپنی زندگی تھی۔ حسد کی زندگی، ساز باز کی زندگی، خواہوں کی زندگی۔۔۔

"اللہ کہاں جا رہے ہو، چوری چوری، ظفر؟" اظہر بھائی کی بیوی بولیں۔ وہ غسل خانے میں کھڑی مہاسوں پر کریم مل رہی تھیں۔

"بس جی۔ اپنے کمرے میں جا رہا ہوں جی۔۔۔"

"ادھر آنے کی تو تم نے قسم کھا رکھی ہے۔" نگہت بھابی اترا کر بولیں۔

"بس جی۔ پڑھائی میں وقت ہی نہیں ملتا۔۔۔"

"میرے پاس بیٹھنے کو وقت نہیں ملتا، عذرا کے پاس پہروں گذارنے کا وقت ملتا ہے" وہ بُرا مان گئیں۔

"وہ تو عذرا بھابی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا لیا تھا جی۔ کل، کریلے گوشت کھلانے کو"

"پھر تو ہمیں بھی کریلے گوشت پکانے پڑیں گے۔"

"نہیں جی، میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے جی"

"تمہاری مرضی ہے۔"

یک دم وہ پیٹھ موڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

ظفر پنجوں کے بل چلتا ہوا، تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ منظر بھائی کی بیوی عذرا

سے منہ پھیر ہو گئی ۔

وہ منی کی پیٹھ دھو کر توری کی طرح لٹکائے چلی آ رہی تھیں ۔ اتنی سی ورزش سے ان کا سانس اکھڑ چکا تھا ۔ اور دودھ چڑھے سینے کا اتار چڑھاؤ بڑی دور سے نظر آتا تھا ۔

”اللہ ۔ ۔ بابا ۔ ۔ ۔ ظفر ۔ ۔ کہاں ؟“

”جی اوپر جا رہا ہوں اپنے کمرے میں“

”منی کو دست آ رہے ہیں ۔ دوائی نہیں لا دے گا کوئی“

”کیمرہ رکھ آؤں جی اوپر ۔ ۔ ۔ ابھی آیا ۔ ۔“

اب تو وہ سرپٹ بھاگا کیونکہ اسے علم تھا کہ عذرا بھابی جن سے اس کے تین رشتے تھے، ان ہی رشتوں کے توسط سے کم از کم تین کام ضرور کروائیں گی ۔ پہلے بچی کو دوائی لا کر پلائی ہو گی ۔ بعد میں کچھ فرنیچر اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھنا پڑے گا ۔ اور اس کے بعد منی کو لے کر اس وقت تک ٹہلانا پڑیگا، جب تک وہ سو نہیں جائیگی ۔ اتنی چھوٹی سی جان آئن سٹائن کی نیند لے کر پیدا ہوئی تھی، دن میں کل تین ساڑھے تین گھنٹے سوتی، اور پھر گلہری کی طرح چاق و چوبند ۔

تیسری منزل پر وہ اور آپا جی رہتے تھے ۔ یہ منزل گو ہر لحاظ سے باقی گھر کے مقابلے میں گوشۂ عافیت تھی لیکن یہاں کی قباحت اپنی تھی ۔ اگر آپا جی گھر ہوتے یعنی وہ اپنے کمرے میں موجود ہوتے ۔ تو شہتیر جیسی سیدھی زندگی بسر کرنا پڑتی ۔ جانگھیہ پہن کر دھوپ میں

لیٹنے کا ٹھاٹھ ختم ہو جاتا - بائی بز کیور لگا کر نیچے آنے جانے والیوں کو نہ تاکا جا سکتا۔ ممنوع کتابیں پڑھنے کے امکانات کم ہو جاتے - سٹل لائف کی تصویریں بنانا ناممکن ہوتا۔

ابا جی کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ مطالعے میں مستغرق نظر آتے تھے۔ ظفر نے گریہ پائی سے اپنے کمرے کا راستہ لیا، نہ جانے ابا جی نے اپنا راڈر کہاں فٹ کر رکھا تھا جسکو چاہتے اور جہاں چاہتے وہیں بلا لیتے۔

"ظفر؟"

"جی ابا جی . . ."

"ذرا ادھر آنا۔"

وہ دم دبائے کتے کی طرح اندر چلا گیا۔

"دنیا کے مذاہب پر یہ بہت اچھی کتاب آئی ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں دلچسپی ہوگی اس میں . . ."

ابا جی پینتالیس اور پچاس کے بیچ میں تھے۔ اپنی بیوی کے بیٹے اور اپنے بڑے بیٹے مظفر کے چھوٹے بھائی لگتے تھے۔ سید ھا قد، منہ میں تمام دانت ذاتی، جسم دبلا پتلا۔ نہ ایسے سینک سلائی کہ کپڑے سے لگیں، نہ موٹے کہ ہاتھی سے دکھائی دیں۔ ایسے انتہا متناسب جسم تھا۔ کپڑے پہننے اس دکان سے سلاتے تھے جہاں ملٹری والے اپنی وردیاں بنواتے ہیں۔ کپڑا بڑا اعلیٰ پہنتے۔ جرنیں ہمیشہ دو رنگے، جینی موچیوں کی صناعی کے اعلیٰ نمونے، پائپ پیتے تھے، اور بات کرتے

وقت باپ کا تمباکو پائپ کی کوکھ میں بھرتے رہتے تھے۔

ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کی اولاد جو کہ چار لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل تھی انہیں اپنا دوست سمجھے۔ بدقسمتی سے جسقدر وہ اس بات کے لئے کوشش کرتے تھے اسی قدر ان کی اولاد ان کی دوستی سے گریز کرتی تھی۔ وہ چاہتے کہ بچے ان سے اپنی اپنی مشکلات کا ذکر کریں اور وہ حسب توفیق دوست بنکر ان کی مشکلات کو رفع کریں۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ ہر بچہ اپنا اپنا دکھ مشک نافے کی طرح اپنے اندر چھپائے پھرتا تھا، حتٰی کہ بڑی بیٹی جو عرصہ پانچ ماہ سے گھر آئی بیٹھی تھی باپ کو یہ نہ بتا سکی کہ اس کے جستی ٹرنک میں ایک عدد طلاق نامہ بھی موجود ہے۔

"کیوں کیسی کتاب ہے؟"

"شکل و صورت سے تو بہت اچھی لگتی ہے۔۔۔ ابا جی۔"

"بڑی ریسرچ کے بعد ایسی کتابیں وجود میں آتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

تمام مذاہب پر سرحتج و مجلد کتاب کو گھٹنوں پر رکھ کر ظفر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"لارڈ رسل کہتا ہے کہ مذاہب کی جنگ کا اب آخری دور دم توڑ رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا تو پورے چھ سو سال تک عیسائی اور مسلمان آپس میں لڑتے رہے۔ ادھر صلاح الدین ایوبی کا ڈنکا بجا تو ادھر عیسائی لوگوں نے رچرڈ شیر دل کو آسمانوں پر چڑھا لیا۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ کیا تمہارا خیال ہے ایسی جنگ اب ہو سکتی ہے بیٹے؟"

ظفر نے کتاب پر گرفت سخت کر کے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ . . . کہ مذہب اب وجہ نزاع نہیں رہا دنیا میں . "

"تمہارا کیا خیال ہے ، ظفر ، مذہب انسانیت کے حق میں نفع بخش ہے کہ

"میں نے کبھی سوچا نہیں اس ضمن میں ابا جی!"

"تمہیں سوچنا چاہیئے . یہ تمہاری سوچنے کی عمر ہے . پکنکوں پر وقت ضائع ک
نہیں ہے ."

ظفر کے دل میں باپ کے خلاف ہلکی سی بغاوت اٹھی .

وہ کتاب پر اور بھی جھک گیا ، خدا جانے پکنک کے متعلق کیسے ابا ج
ہو گیا .

"میں تم سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے دوست ہو . اس سارے گ
نیت کو کوئی نہیں سمجھتا . سب مجھے ڈکٹیٹر سمجھتے ہیں . حالانکہ میں چینی لوگوں کی ط
حلیم ہوں . کیا خیال ہے تمہارا ، مذہب انسانیت کے حق میں کیسا ہے . نفع
مضرت رساں ؟"

"پہلے میں یہ کتاب پڑھ لوں ، پھر . . پھر ہم آپس میں گفتگو کریں گے

"ہاں یہ ٹھیک ہے . اگلے ہفتے تک مطالعہ کر لو گے نا اس کتاب کا
سے سوال کیا ."

"جی ہاں ! انشاء اللہ ."

"ہکسلے کا ناول پڑھ لیا ہے تم نے۔۔" آباجی نے پوچھا

"دراصل جی آج کل پڑھائی کا بہت زور ہے، وقت نہیں ملا، ساٹھ صفحے پڑھے ہیں میں نے اسکے۔"

"کیسا ہے؟"

ظفر نے ہکسلے کا ناول کھول کر بھی نہ دیکھا تھا۔ گال سے زبان چپکا کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر بولا۔

"اس کا پڑھنا سہل نہیں ہے آباجی۔۔۔ نہایت دقیق باتیں کرتا ہے ہکسلے۔۔۔ ناولوں میں بھی۔"

پائپ کی کوکھ میں تمباکو ٹھونستے ہوئے پورے آدھ گھنٹے تک انہوں نے تصریح کے ساتھ ہکسلے پر تبصرہ کیا

آباجی جب بولنے پر آتے تھے تو پروفیسر اعجاز سے بھی زیادہ معجز بیانی کرتے تھے

"تم کو مطالعے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہیئے ظفر!"

"ہاں جی۔۔۔ وہ تو ہے۔۔"

"سول سروس چاہے نہ کرو لیکن اتنی بات طے ہے کہ امتحان ضرور دینا ہوگا تمہیں۔"

"ہاں جی! وہ تو دونگا ضرور"

"اگر انسان باقاعدگی سے اخبار کا مطالعہ کرے۔ جنرل نالج اچھی ہو۔ کلاسیکس